انسان کا معاشی مسئلہ
اور اس کا اسلامی حل

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انسان کا معاشی مسئلہ

اور

اس کا اسلامی حل

موجودہ زمانے میں ملکوں اور قوموں کے اور بحیثیت مجموعی دنیا کے معاشی مسائل کو جو اہمیت دی جا رہی ہے شاید اس سے پہلے کم از کم نمایاں طور پر ان کو اتنی اہمیت کبھی نہیں دی گئی۔ "نمایاں طور پر" کا لفظ میں اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ حقیقت میں انسان کی زندگی میں اس کی معاش جس قدر اہمیت رکھتی ہے اس کے لحاظ سے ہر زمانے میں افراد، جماعتوں، قوموں، ملکوں اور تمام انسانوں نے اس کی طرف بہر حال توجہ کی ہے لیکن آج اس توجہ کو جس چیز نے نمایاں کر دیا ہے وہ معاشیات کے نام سے ایک باقاعدہ علم کا بڑی بڑی کتابوں، بھاری بھرکم اصطلاحوں اور پرشوکت اداروں کے ساتھ موجود ہونا اور ساتھ ہی ضروریاتِ زندگی کی پیدائش، فراہمی اور اکتساب کے طریقوں کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جانا ہے۔ ان اسباب سے آج معاشی مسائل پر بحث اور گفتگو اور عالمانہ تحقیق کا وہ زور شور ہے کہ ان کے آگے انسانی زندگی کے سارے مسائل دب کر رہ گئے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس چیز پر دنیا بھر کی توجہات اس طرح مرکوز ہو گئی ہیں وہ بجائے سلجھنے اور صاف ہونے کے اور زیادہ الجھتی اور معمہ بنتی چلی جاتی ہے۔ علم المعیشت کی موٹی موٹی اصطلاحوں نے اور ماہرینِ معاشیات کی عالمانہ موشگافیوں نے عام لوگوں کو اس قدر دہشت زدہ کر دیا ہے کہ وہ غریب ان اعلیٰ درجوں کی فنی بحثوں کو

سن کر اس طرح اپنے معاشی مسئلے کی ہولناکی سے مرعوب اور اس کے حل کی تمام توقعات سے مایوس ہو جاتے ہیں، جس طرح ایک بیمار کسی ڈاکٹر کی زبان سے اپنی بیماری کا کوئی موٹا سا لاطینی نام سن کر ہول کھاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ جب مجھے ایسی سخت بیماری لاحق ہو گئی ہے تو میری جان کا اب اللہ ہی حافظ ہے۔ حالانکہ ان اصطلاحوں اور فنی بحثوں کا غلاف اتار کر سیدھے سادے فطری طریقے سے دیکھا جائے تو انسان کا معاشی مسئلہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے اور اس مسئلہ کے حل کی مختلف صورتیں جو دنیا میں اختیار کی گئی ہیں ان کے مفید اور مضر پہلو بھی بغیر کسی دقّت کے دیکھے جا سکتے ہیں اور اس کے حل کی صحیح فطری صورت جو کچھ ہو سکتی ہے اس کے سمجھنے میں بھی کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

اصطلاحات کے چکّر اور فنی پیچیدگیوں کے طلسمات نے اس مسئلے کو جس قدر الجھایا ہے اس پر مزید الجھن اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ انسان کے معاشی مسئلے کو جو دراصل انسانی زندگی کے عظیم تر مسئلے کا ایک جز تھا، مجموعے سے الگ کر کے بجائے خود ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا اور رفتہ رفتہ یہ لَے اتنی بڑھی کہ معاشی مسئلے ہی کو پوری زندگی کا مسئلہ سمجھ لیا گیا۔ یہ پہلی غلطی سے بھی زیادہ بڑی غلطی ہے جس کی وجہ سے اس گتھی کو سلجھانا محال ہو گیا ہے! اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی امراضِ جگر کا ماہر انسانی جسم کے مجموعی نظام سے الگ کر کے اور اس نظام میں جو جگر کی حیثیت ہے اس کو نظر انداز کر کے جگر کو بس جگر کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دے اور پھر اس دیکھنے میں اتنا مستغرق ہو کہ آخر کار اسے پورا انسانی جسم بس ایک جگر ہی جگر نظر آنے لگے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر انسانی صحت کے سارے مسائل کو جگریات سے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ مسائل کس قدر ناقابلِ حل ہو جائیں گے اور آدمی بے چارے کی جان کس قدر شدید خطرے میں مبتلا ہو کر رہے گی۔ بس اسی پر قیاس کر لیجیے کہ جب معاشیات کو انسانیات کے مجموعہ میں سے نکال کر الگ کر لیا جائے اور پھر اسی کو عین انسانیت قرار دے کر سارے

مسائلِ زندگی اسی سے حل کیے جانے لگیں تو بجز سرگشتگی وحیرانی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

دورِ جدید کے فتنوں میں سے یہ ماہرینِ خصوصی (SPECIALISTS) کا فتنہ بھی ایک بڑا فتنہ ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل پر مجموعی نظر کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے، انسان مختلف علوم وفنون کے یک چشم ماہرین کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی طبیعیات کا ماہر ہے تو وہ ساری کائنات کا معمہ صرف ت کے بل پر حل کرنے لگتا ہے، کسی کے دماغ پر نفسیات کا تسلط ہے تو وہ اپنے نفسیاتی تجربات ومشاہدات کے اعتماد پر پورا فلسفۂ حیات مرتب کرنا چاہتا ہے، کسی اللہ کے بندے کی نظر جنسیات پر جم کر رہ گئی ہے تو وہ کہتا ہے کہ پوری زندگی بس شہوانیت (SEX) کے محور پر گھوم رہی ہے حتیٰ کہ خدا کا خیال بھی انسان کے دماغ میں اسی راستے سے آیا ہے۔ اسی طرح جو لوگ معاشیات میں مستغرق ہیں، انسان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ معاش تیری زندگی کا اصل مسئلہ ہے اور باقی سارے مسائل اسی جڑ کی شاخیں ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک کُل کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کُل کے اندر ان سب کا ایک خاص مقام ہے اور اس مقام کے لحاظ ہی سے ان کی اہمیت بھی ہے۔ انسان ایک جسم رکھتا ہے جو قوانینِ طبعی کے تحت ہے، اس لحاظ سے انسان طبیعیات کا موضوع بھی ہے مگر وہ نرا جسم ہی نہیں ہے کہ صرف طبیعیات سے اس کے سارے مسائل حل کیے جا سکیں۔ انسان ایک ذی حیات ہستی ہے جس پر حیاتی قوانین جاری ہوتے ہیں، اس لحاظ سے وہ علم الحیات (BIOLOGY) کا موضوع ہے، مگر وہ نرا ذی حیات نہیں ہے کہ صرف حیاتیات یا حیوانیات (ZOOLOGY) ہی سے اس کی زندگی کا پورا قانون اخذ کیا جا سکے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے غذا کی، پوشش کی اور مکان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اس لحاظ سے معاشیات اس کی زندگی کے ایک اہم شعبے پر حاوی ہے، مگر وہ محض ایک کھانے، پہننے اور گھر بنا کر رہنے والا حیوان ہی نہیں ہے کہ تنہا معاشیات ہی پر اس کے فلسفۂ حیات کی بنا

رکھ دی جائے۔ انسان اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لیے تناسل پر بھی مجبور ہے جس کے لیے اس کے اندر ایک زبردست صنفی میلان پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے صنفیات کا علم بھی اس کی زندگی کے ایک اہم پہلو سے تعلق رکھتا ہے مگر وہ بالکل نسل کشی کا آلہ نہیں ہے کہ بس صنفیات ہی کی عینک لگا کر اسے دیکھا جانے لگے۔ انسان ایک نفس رکھتا ہے جس میں شعور و ادراک کی مختلف قوتیں اور جذبات و خواہشات کی مختلف طاقتیں ہیں، اس لحاظ سے نفسیات اس کے وجود کے ایک بڑے شعبے پر محیط ہے، لیکن وہ از سرتا پا نفس ہی نفس نہیں ہے کہ نفسیات کے علم سے اس کی زندگی کی پوری اسکیم بنائی جاسکے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے جو عین اپنی فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر رہے اس لحاظ سے اس کی زندگی کے بہت سے پہلو عمرانیات کے تحت آتے ہیں، لیکن متمدن ہستی ہونا اس کا تمام وجود نہیں ہے کہ محض علوم عمران کے ماہرین بیٹھ کر اس کے لیے مکمل نظام حیات وضع کر سکیں۔ انسان ایک ذی عقل ہستی ہے جس کے اندر محسوسات سے ماوراء معقولات کی طلب بھی پائی جاتی ہے اور وہ عقلی اطمینان چاہتا ہے، اس لحاظ سے علوم عقلیہ اس کے خاص مطالبے کو پورا کرتے ہیں، مگر وہ پورا کا پورا عقل ہی نہیں ہے کہ محض معقولات کے بل بوتے پر اس کے لیے ایک لائحۂ زندگی بنایا جاسکے۔ انسان ایک اخلاقی و روحانی وجود ہے جس میں بھلے اور برے کا امتیاز اور معقولات و محسوسات دونوں سے ماوراء حقیقتوں تک پہنچنے کا داعیہ بھی پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے اخلاقیات و روحانیات اس کے ایک اور اہم مطالبے کو پورا کرتے ہیں، مگر وہ سرتا پا اخلاق اور روح ہی نہیں ہے کہ مجرد اخلاقیات و روحانیات سے اس کے لیے پورا نظام زندگی بنایا جاسکے۔ دراصل انسان بیک وقت یہ سب کچھ ہے اور ان تمام حیثیتوں کے علاوہ ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ اپنے تمام وجود اور اپنی زندگی کے سارے شعبوں سمیت وہ کائنات کے اس عظیم الشان نظام کا ایک جزو

ہے اور اس کی زندگی کا ضابطہ لازمی طور پر اس امر کا تعین چاہتا ہے کہ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا جزو ہونے کی حیثیت سے اس کو کس طرح کام کرنا چاہیے؟ نیز اس کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنے مقصد زندگی کا تعین کرے اور اسی لحاظ سے فیصلہ کرے کہ اسے کس لیے کام کرنا ہے؟ یہ آخری دونوں سوال انسانی زندگی کے بنیادی سوال ہیں، انھیں پر ایک فلسفۂ حیات بنتا ہے پھر اس فلسفۂ حیات کے تحت تمام وہ علوم جو دنیا اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں، اپنے اپنے دائرے کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور کم و بیش ان سب سے مل کر ایک لائحۂ عمل بنتا ہے جس پر انسانی زندگی کا پورا کارخانہ چلتا ہے۔

اب یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر آپ اپنی زندگی کے مسئلے کو سلجھانا چاہیں تو اس کے لیے یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ آپ خوردبین لگا کر صرف اسی ایک مسئلے پر نظر کو محدود کر کے دیکھیں یا اس خاص شعبۂ حیات کے لیے جس سے وہ مسئلہ تعلق رکھتا ہے ایک قسم کا تعصب لیے ہوئے پورے مجموعۂ حیات پر نظر ڈالیں بلکہ صحیح فہم و ادراک کے لیے پورے مجموعہ کے اندر رکھ کر اسے دیکھنا ہوگا اور غیر متعصبانہ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ زندگی کے کسی شعبے میں بگاڑ پائیں اور اس کو درست کرنا چاہیں تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہے کہ آپ کسی ایک مسئلہ زندگی کو کل مسئلۂ زندگی قرار دے کر سارے کارخانے کو اسی ایک پرزے کے گرد گھما دیں۔ اس حرکت سے تو آپ اور زیادہ عدمِ توازن پیدا کر دیں گے۔ صحیح طریقۂ اصلاح یہ ہے کہ غیر متعصبانہ نگاہ سے پورے نظامِ زندگی کا اس کے بنیادی فلسفے سے لے کر شاخوں کی تفصیلات تک دیکھیے اور تحقیق کیجیے کہ خرابی کس جگہ اور کس نوعیت کی ہے؟

انسان کے معاشی مسئلے کو سمجھنے اور صحیح طور پر حل کرنے میں، جو مشکل پیش آ رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس مسئلے کو بعض لوگ صرف معاشیات کی نگاہ سے

دیکھتے ہیں، بعض اس کی اہمیت میں مبالغہ کرکے اسے کُل مسئلہ زندگی قرار دے رہے ہیں اور بعض اس سے بھی تجاوز کرکے زندگی کا بنیادی فلسفہ اور اخلاق اور تمدن و معاشرت کا سارا نظام معاشی بنیاد ہی پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر معاشیات ہی کو اساس ٹھہرایا جائے تو انسان کا مقصدِ زندگی اُس بیل کے مقصدِ زندگی سے کچھ بھی مختلف نہیں ٹھہرتا جس کی تمام سعی و جہد کی غایت یہ ہے کہ ہری ہری گھاس کھا کر خوش وخرم اور تنومند ہوجائے اور کائنات میں اس کی یہ حیثیت قرار پاتی ہے کہ وہ بس چراگاہِ عالم میں ایک آزاد چرندہ ہے۔ اسی طرح اخلاقیات، روحانیات، معقولات، عمرانیات، نفسیات اور تمام دوسرے علوم کے دائروں میں بھی معاشی نقطۂ نظر کے غالب آجانے سے نہایت شدید عدم توازن کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے کیونکہ ان شعبہ ہائے زندگی کے لیے معاشیات میں کوئی بنیاد اس کے سوا نہیں ہے کہ اخلاق و روحانیت، نفس پرستی و مادہ پرستی میں اور معقولات، ماکولات میں تبدیل ہوجائیں۔ عمرانیات کی ساری ترتیب حقائق عمرانی کے بجائے کاروباری اغراض پر قائم ہو اور نفسیات میں انسان کا مطالعہ محض ایک معاشی حیوان کی حیثیت سے کیا جانے لگے۔ کیا اس سے بڑھ کر انسانیت پر کوئی اور ظلم ہوسکتا ہے؟

اصل معاشی مسئلہ

اب اگر ہم اصطلاحی اور فنی پیچیدگیوں سے بچ کر ایک سیدھے سادے طریقے سے دیکھیں تو انسان کا معاشی مسئلہ ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تمدن کی رفتارِ ترقی کو قائم رکھتے ہوئے کس طرح تمام انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی بہم پہونچنے کا انتظام ہو اور کس طرح سوسائٹی میں ہر شخص کو اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشوونما دینے اور اپنے کمالِ لائق تک پہونچنے کے مواقع حاصل رہیں؟

قدیم ترین زمانے میں انسان کے لیے معاش کا مسئلہ قریب قریب اتنا ہی سہل تھا جتنا حیوانات کے لیے ہے۔ خدا کی زمین پر بے شمار سامانِ زندگی پھیلا ہوا ہے۔ ہر

مخلوق کے لیے جس قدر رزق کی ضرورت ہے وہ بافراط مہیا ہے۔ ہر ایک اپنا رزق تلاش کرنے کے لیے نکلتا ہے اور جا کر خزائنِ رزق میں سے حاصل کر لیتا ہے، کسی کو نہ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ اس کا رزق کسی دوسری مخلوق کے قبضے میں ہے۔ تقریباً یہی حالت انسان کی بھی تھی کہ گیا اور قدرتی رزق، خواہ وہ پھلوں کی شکل میں ہو یا شکار کے جانور کی شکل میں، حاصل کر لیا، قدرتی پیداوار سے بدن ڈھانکنے کا انتظام کر لیا، زمین میں جہاں موقع دیکھا، ایک سر چھپانے اور پڑ رہنے کی جگہ بنا لی۔ لیکن خدا نے انسان کو اس لیے نہیں پیدا کیا تھا کہ وہ زیادہ مدت تک اسی حال میں رہے۔ اس نے انسان کے اندر ایسے فطری داعیات رکھے تھے کہ وہ انفرادی زندگی چھوڑ کر اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اپنی صنعت سے اپنے لیے ان ذرائعِ زندگی سے بہتر ذرائع پیدا کر لے جو قدرت نے مہیا کیے تھے۔ عورت اور مرد کے درمیان دائمی تعلق کی فطری خواہش، انسانی بچے کا طویل مدت تک ماں باپ کی پرورش کا محتاج ہونا، اپنی نسل کے ساتھ انسان کی گہری دلچسپی اور خونی رشتوں کی محبت، یہ وہ چیزیں تھیں جو اسے اجتماعی زندگی پر مجبور کرنے کے لیے خود فطرت ہی نے اس کے اندر رکھ دی تھیں۔ اس طرح انسان کا خودرو پیداوار پر قانع نہ ہونا اور زراعت سے اپنے لیے خود غلہ پیدا کرنا، پتوں سے جسم ڈھانکنے پر قانع نہ ہونا اور اپنی صنعت سے اپنے لیے لباس تیار کرنا، غاروں اور بھٹوں میں اپنے رہنے پر مطمئن نہ ہونا اور اپنے لیے خود گھر بنانا، اپنی ضروریات کے لیے جسمانی آلات ایجاد کرنا، یہ بھی فطرت ہی نے اس کے اندر ودیعت کیا تھا اور اس کا بھی لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ متمدن ہو۔ پس اگر انسان متمدن ہوا تو اس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ عین اس کی فطرت کا تقاضا اور اس کے خالق کا منشاء یہی تھا۔

تمدن کی پیدائش کے ساتھ چند چیزیں ناگزیر تھیں:۔

- ایک یہ کہ انسان کی ضروریاتِ زندگی بڑھیں اور ہر شخص خود اپنی تمام ضروریات

فراہم نہ کرسکے بلکہ اس کی کچھ ضرورتیں دوسروں سے اور دوسروں کی اس سے متعلق ہوں۔

دوسرے یہ کہ ضروریاتِ زندگی کا مبادلہ (EXCHANGE) عمل میں آئے اور رفتہ رفتہ مبادلۂ اشیاء کا ایک واسطہ (MEDIUM OF EXCHANGE) مقرر ہو جائے۔

تیسرے یہ کہ اشیائے ضروریات تیار کرنے کے آلات اور حمل ونقل کے وسائل میں اضافہ ہو اور جتنی نئی چیزیں انسان کے علم میں آئیں ان سب سے وہ فائدہ اٹھاتا چلا جائے۔

چوتھے یہ کہ آدمی کو اس امر کا اطمینان حاصل ہو کہ وہ چیزیں جن کو اس نے خود اپنی محنت سے حاصل کیا ہے، وہ آلات جن سے وہ کام کرتا ہے، وہ زمین جس پر اس نے گھر بنایا ہے، وہ جگہ جس میں وہ اپنے پیشے کا کام کرتا ہے، یہ سب اسی کے قبضے میں رہیں گی اور اس کے بعد ان لوگوں کی طرف منتقل ہوں گی جو دوسروں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔

اس طرح مختلف پیشوں کا پیدا ہونا، خرید و فروخت، اشیاء کی قیمتوں کا تعین، روپے کا معیارِ قیمت کی حیثیت سے جاری ہونا، بین الاقوامی لین دین اور درآمد و برآمد تک نوبت پہونچنا، نئے نئے آلات و وسائل (MEANS OF PRODUCTION) کا استعمال میں آنا اور حقوقِ ملکیت و وراثت کا وجود میں آنا، یہ سب عین مقتضائے فطرت تھا اور ان میں سے کوئی چیز بھی گناہ نہ تھی کہ اب اس سے توبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

مزید برآں تمدن کے نشو و نما کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ :-

ا۔ مختلف انسانوں کی قوتوں اور قابلیتوں کے درمیان جو فرق خود فطرت نے رکھا ہے، اس کی وجہ سے بعض انسانوں کو اپنی اصلی ضرورت سے زیادہ کمانے کا موقع

مل جائے اور بعض اپنی ضروریات کے مطابق اور بعض اس سے کم کمائیں۔

۲۔ وراثت کے ذریعہ سے بھی بعض کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اچھے وسائل مل جائیں اور بعض کم وسائل کے ساتھ اور بعض بے وسیلہ کارزارِ حیات میں قدم رکھیں۔

۳۔ قدرتی اسباب سے ہر آبادی میں ایسے لوگ موجود رہیں جو کسبِ معاش کے کام میں حصہ لینے اور اسبابِ زندگی کے مبادلے میں شریک ہونے کے قابل نہ ہوں مثلاً بچے، بوڑھے، بیمار، معذور وغیرہ۔

۴۔ بعض انسان خدمت لینے والے اور بعض خدمت انجام دینے والے ہوں اور اس طرح آزادانہ صنعت و تجارت اور زراعت کے علاوہ نوکری اور مزدوری کی صورتیں بھی پیدا ہو جائیں۔

یہ سب بھی بجائے خود انسانی تمدن کے فطری مظاہر اور قدرتی پہلو ہیں۔ ان صورتوں کا رونما ہونا بھی اپنی جگہ کوئی برائی یا گناہ نہیں ہے کہ ان کے استیصال کی فکر کی جائے۔ تمدن کی خرابی کے دوسرے اسباب سے جو برائیاں پیدا ہوئی ہیں ان کے اصل سبب کو نہ پاکر بہت سے گھبرا اٹھتے ہیں اور کبھی شخصی ملکیت کو، کبھی روپے کو، کبھی مشین کو، کبھی انسانوں کی فطری مساوات کو اور کبھی خود تمدن ہی کو کوسنے لگتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ غلط تشخیص اور غلط تجویزِ علاج ہیں۔ انسانی فطرت کے تقاضے سے تمدن میں جو نشوونما ہوتا ہے اور اس نشوونما سے فطرتاً جو صورتیں رونما ہوتی ہیں ان کو روکنے کی ہر کوشش نادانی ہے اور اس کے نتیجے میں فلاح کے بجائے تباہی کا زیادہ امکان ہے۔ انسان کا اصل معاشی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تمدن کی ترقی کو کس طرح روکا جائے، یا اس کے قدرتی مظاہر کو کس طرح بدلا جائے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمدن کے نشوونما کی فطری رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی ظلم و بے انصافی کو کیسے روکا جائے اور فطرت کا یہ منشاء کہ ہر مخلوق کو اس کا رزق پہونچے کیونکر پورا کیا جائے اور ان رکاوٹوں کو کس طرح دور

کیا جائے جن کی بدولت بہت سے انسانوں کی قوتیں اور قابلیتیں محض وسائل کے فقدان کی وجہ سے ضائع ہوتی ہیں۔

معاشی انتظام کی خرابی کا سبب

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور خرابی کی نوعیت کیا ہے؟

نظام معیشت کی خرابی کا نقطہ آغاز خودغرضی کا حد اعتدال سے بڑھ جانا ہے پھر دوسرے رذائل اخلاق اور ایک فاسد نظام سیاست کی مدد سے یہ چیز بڑھتی اور پھیلتی ہے یہاں تک کہ پورے معاشی انتظام کو خراب کر کے زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اپنا زہریلا اثر پھیلا دیتی ہے۔ ابھی میں بیان کر چکا ہوں کہ شخصی ملکیت اور بعض انسانوں کا بعض کی نسبت بہتر معاشی حالت میں ہونا، یہ دونوں عین فطرت کے مقتضیات تھے اور بجائے خود ان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر انسان کی تمام اخلاقی صفات کو توازن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور خارج میں بھی ایک ایسا نظام سیاست موجود ہوتا جو زور اور قوت کے ساتھ عدل قائم رکھتا، تو ان سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جس چیز نے انہیں خرابیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ جو لوگ فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ خودغرضی، تنگ نظری، بداندیشی، بخل، حرص، بددیانتی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شیطان نے انہیں سمجھایا کہ تمہاری اصلی ضرورت سے زائد جو وسائلِ معیشت تمہیں ملتے ہیں اور جن پر تمہیں حقوقِ مالکانہ حاصل ہیں، ان کے صحیح و معقول مصرف صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو اپنی آسائش، آرائش، لطف، تفریح اور خوش باشی میں صرف کرو اور دوسرے یہ کہ ان کو مزید وسائلِ معیشت پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال کرو اور بن پڑے تو انہیں کے ذریعہ سے انسانوں کے خدا بن جاؤ۔

پہلی شیطانی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مندوں نے جماعت کے ان افراد کا حق ماننے سے انکار کر دیا جو دولت کی تقسیم میں حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں یا اپنی اصلی ضرورت سے کم حصہ پاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بالکل جائز سمجھا کہ ان لوگوں کو فاقہ کشی اور خستہ حالی میں چھوڑ دیا جائے۔ ان کی تنگ نظری نے یہ نہ دیکھا کہ اس رویّہ کی وجہ سے انسانی جماعت کے بہت سے افراد جرائم پیشہ بنتے ہیں، جہالت اور دنائتِ اخلاق میں مبتلا ہوتے ہیں، جسمانی کمزوری اور امراض کا شکار ہوتے ہیں، ان کی جسمانی قوتیں نشو و نما پانے اور انسانی تہذیب و تمدّن کے ارتقاء میں اپنا حصہ ادا کرنے سے رہ جاتی ہیں اور اس سے وہ سوسائٹی من حیثیت مجموعی نقصان اٹھاتی ہے جس کے وہ خود بھی ایک جز ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ان دولت مندوں نے اپنی اصلی ضروریات پر بے شمار ضروریات کا اضافہ کیا اور بہت سے انسانوں کو جن کی قابلیتیں تمدّن و تہذیب کی بہتر خدمات کے لیے استعمال ہو سکتی تھیں اپنے نفسِ شریر کی خود ساختہ ضرورتوں کے پورا کرنے میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان کے لیے زنا ایک ضرورت تھی جس کی خاطر فاحشہ عورتوں قرمسا اور دیّوثوں کا ایک لشکر فراہم ہوا اور ان کے لیے غنا بھی ایک ضرورت تھی جس کی خاطر گویّوں، مغنیوں، سازندوں اور آلاتِ موسیقی تیار کرنے والوں کی ایک اور فوج تیار کی گئی۔ ان کے لیے بے شمار قسم کے تفریحات بھی ضروری تھیں جن کی خاطر مسخروں، نقالوں، ایکٹروں اور ایکٹرسوں، داستان گوؤں، مصوّروں اور نقاشوں اور بہت سے فضول پیشہ وروں کا ایک اور گروہ کثیر مہیا کیا گیا۔ ان کے لیے شکار بھی ضروری تھا جس کی خاطر بہت سے انسان کوئی بھلا کام کرنے کے بجائے اس کام پر لگائے گئے کہ جنگلوں میں جانوروں کو ہانکتے پھریں۔ ان کے لیے سرور و نشاط اور خود رفتگی بھی ایک ضرورت تھی جس کی خاطر بہت سے انسان شراب، کوکین، افیون اور دوسرے مسکرات کی فراہمی میں مشغول کیے گئے۔ غرض اس طرح ان شیطان کے

بھائیوں نے اتنے ہی پر رحم نہ کیا کہ بے رحمی کے ساتھ سوسائٹی کے ایک بڑے حصے کو اخلاقی و روحانی اور جسمانی تباہی میں مبتلا ہونے کے لیے چھوڑ دیا، بلکہ مزید ظلم یہ کیا کہ ایک اور بڑے حصے کو صحیح اور مفید کاموں سے ہٹا کر بے ہودہ، ذلیل اور نقصان دہ کاموں میں لگا دیا اور تمدن کی رفتار کو راہِ راست سے ہٹا کر ایسے راستوں کی طرف پھیر دیا جو انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو گیا، انسانی سرمائے (HUMAN-CAPITAL) کو ضائع کرنے کے ساتھ انہوں نے مادی سرمائے کو بھی غلط طریقے سے استعمال کیا۔ ان کو محلات، کوٹھیوں، گلستانوں، تفریح گاہوں، ناچ گھروں وغیرہ کی ضرورت لاحق ہوئی، حتیٰ کہ مرنے کے بعد زمین میں لیٹنے کے لیے بھی ان کم بختوں کو ایکڑوں زمین اور عالی شان عمارتوں کی حاجت درپیش ہوئی اور اس طرح وہ زمین، وہ سامان تعمیر اور وہ انسانی محنت جو بہت سے بندگانِ خدا کے لیے سکونت کا انتظام کرنے کو کافی ہو سکتی تھی، ایک ایک عیاش آدمی کے مستقر اور مستودع پر صرف ہو گئی۔ ان کو زیوروں، نفیس لباسوں، اعلیٰ درجے کے آلات و ظروف، زینت و آرائش کے سامانوں شاندار سواریوں اور نہ معلوم کن کن چیزوں کی ضرورت پیش آئی حتیٰ کہ ان ظالموں کے دروازے بھی قیمتی پردوں کے بغیر ننگے رہے جاتے تھے، ان کی دیواریں بھی سیکڑوں اور ہزاروں روپے کی تصویروں سے مزین ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں، ان کے کمروں کی زمین بھی ہزاروں روپے کے قالین اوڑھنا چاہتی تھی، ان کے کتوں کو بھی مخمل کے گدے اور سونے کے پٹے درکار تھے، اس طرح وہ بہت سا مواد اور وہ کثیر انسانی عمل جو ہزارہا انسانوں کا تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے کے کام آسکتا تھا ایک ایک شخص کی نفس پرستی کے لیے وقف ہو گیا۔

یہ تو شیطانی رہنمائی کے ایک حصے کا نتیجہ تھا، دوسری رہنمائی کے نتائج اس سے بھی زیادہ خراب نکلے۔ یہ اصول کہ اپنی ضرورت سے زائد جو وسائلِ معیشت کسی انسان کے

قبضے میں آگئے ہوں ان کو وہ جمع کرتا چلا جائے اور پھر مزید وسائل معیشت حاصل کرنے کے لیے استعمال کرے، اوّل تو بداہتہً غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے معیشت کے اسباب جو زمین پر پیدا کیے ہیں مخلوق کی حقیقی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیدا کیے ہیں تمہارے پاس خوش قسمتی سے اگر کچھ زیادہ اسباب آگئے ہیں تو یہ دوسروں کا حصہ تھا جو تم تک پہنچ گیا، اسے جمع کرنے کہاں چلے؟ اپنے گرد و پیش دیکھو، جو لوگ سامانِ زیست میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کے قابل نظر آتے، یا اسے حاصل کرنے میں ناکام رہ گئے ہیں، یا جنہوں نے اپنی ضروریات سے کم پایا ہے، سمجھ لو کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا حصہ تمہارے پاس پہنچا ہے۔ وہ حاصل نہیں کر سکے، تو تم ان تک پہنچا دو۔ یہ صحیح کام کرنے کے بجائے اگر تم ان اسباب کو اور زیادہ اسبابِ معاش حاصل کرنے کے لیے استعمال کرو گے تو یہ غلط کام ہو گا، کیونکہ بہرحال وہ مزید اسباب جو تم حاصل کرو گے تمہاری ضرورت سے اور بھی زیادہ ہوں گے، پھر ان کے حصول کی کوشش بجز اس کے کہ تمہاری حرص و ہوس کی تسکین کا ذریعہ ہو، اور کیا مفید پہلو رکھتی ہے؟ حصولِ معاش کی سعی میں تم اپنے وقت، محنت اور قابلیت کا جتنا حصہ اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے لیے صرف کرتے ہو، وہ تو صحیح اور معقول مصرف میں صرف ہوتا ہے مگر اس واقعی ضرورت سے زائد چیزوں کو اس کام میں صرف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم معاشی حیوان بلکہ دولت پیدا کرنے کی مشین بن رہے ہو، حالانکہ تمہارے وقت، محنت اور ذہنی و جسمانی قوتوں کے لیے کسبِ معاش کے سوا اور زیادہ بہتر مصرف بھی ہیں۔ پس عقل اور فطرت کے لحاظ سے یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے جو شیطان نے اپنے شاگردوں کو سکھایا ہے لیکن اس اصول پر جو عملی طریقے بنے ہیں۔ وہ اس قدر قابلِ لعنت اور ان کے نتائج اتنے ہولناک ہیں کہ ان کا صحیح تخمینہ بھی مشکل ہے۔

زائد از ضرورت وسائلِ معیشت کو مزید وسائل قبضے میں لانے کے لیے استعمال

کرنے کی دو صورتیں ہیں :۔

ایک یہ کہ ان وسائل کو سود پر قرض دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انہیں تجارتی اور صنعتی کاموں میں لگایا جائے۔

یہ دونوں طریقے اپنی نوعیت میں کچھ ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن دونوں کے مشترکہ عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک وہ قلیل طبقہ جو اپنی ضرورت سے زیادہ وسائل معاش رکھتا ہے اور اپنے وسائل کو مزید وسائل کھینچنے کے لیے وقف کر دیتا ہے، دوسرا وہ کثیر طبقہ جو اپنی ضروریات کے مطابق یا اس سے کم وسائل رکھتا ہے یا بالکل نہیں رکھتا۔ ان دونوں طبقوں کے مفاد نہ صرف ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں بلکہ لامحالہ ان کے درمیان کشمکش اور نزاع برپا ہوتی ہے اور یوں انسان کا معاشی انتظام جس کو فطرت نے مبادلہ پر مبنی کیا تھا، محاربے پر قائم ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر یہ محاربہ جتنا جتنا بڑھتا جاتا ہے، مال دار طبقہ تعداد میں کم اور نادار طبقہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے، کیونکہ اس محاربے کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ جو زیادہ مال دار ہے وہ اپنے مال کے زور سے کم مال دار لوگوں کے وسائل بھی کھینچ لیتا ہے اور اسے نادار طبقے میں دھکیل دیتا ہے۔ اس طرح زمین کے اسبابِ معاش روز بروز کم اور کم تر حصۂ آبادی کے پاس سمٹتے چلے جاتے ہیں اور روز بروز زیادہ سے زیادہ حصۂ آبادی مفلس یا مال داروں کا دست نگر ہوتا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ محاربہ چھوٹے پیمانے پر شروع ہوتا ہے، پھر بڑھتے بڑھتے ملکوں اور قوموں تک پھیلتا ہے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھی ہل من مزید کی صدا لگاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب ایک ملک کا عام دستور یہ ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہو، وہ اپنے فاضل مال کو نفع آور کاموں

میں لگا دیں اور یہ دولت اشیائے ضرورت کی تیاری پر صرف ہو تو ان کی لگائی ہوئی پوری رقم کا فائدہ سمیت وصول ہونا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ جس قدر اشیاء ملک میں تیار ہوئی ہیں وہ سب کی سب اسی ملک میں خرید لی جائیں، مگر عملاً ایسا نہیں ہوتا اور درحقیقت یوں ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ ضرورت سے کم مال رکھنے والوں کی قوت خریداری کم ہوتی ہے، اس لیے وہ ضرورت مند ہونے کے باوجود ان چیزوں کو خرید نہیں سکتے اور ضرورت سے زائد مال رکھنے والے اس فکر میں ہوتے ہیں کہ جتنی آمدنی ہو اس میں سے ایک حصہ پس انداز کر کے نفع آور کاموں میں لگائیں، اس لیے وہ اپنا سب مال خریداری پر صرف نہیں کرتے اس طرح لازمی طور پر تیار کردہ مال کا ایک حصہ فروخت ہوئے بغیر رہ جاتا ہے، جس کے دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ مال داروں کی لگائی ہوئی رقم کا ایک حصہ بازیافت ہونے سے رہ گیا اور یہ رقم ملک کی حرفت (INDUSTRY) کے ذمے قرض رہا۔ یہ صرف ایک چکر کا حال ہے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے جتنے چکر ہوں گے ان میں سے ہر ایک میں مالدار طبقہ اپنی حاصل شدہ آمدنی کا ایک حصہ پھر نفع آور کاموں میں لگاتا چلا جائے گا اور جو رقمیں بازیافت ہونے سے رہ جاتی ہیں ان کی مقدار ہر چکر میں بڑھتی چلی جائے گی اور ملک کی حرفت پر ایسے قرض کا بار دوگنا، چوگنا، ہزارگنا ہوتا چلا جائے گا جس کو خود وہ ملک کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایک ملک کو جو دیوالیہ پن کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اُس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ جتنا مال ملک میں فروخت ہونے سے رہ جاتے اسے دوسرے ملکوں میں لے جا کر فروخت کیا جائے یعنی ایسے ملک تلاش کیے جائیں جن کی طرف یہ ملک اپنے دیوالیہ پن کو منتقل کر دے۔

یوں یہ محاربہ ملکی حدود سے گزر کر بین الاقوامی دائرے میں قدم رکھتا ہے اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی ایک ملک ہی ایسا نہیں ہے جو اس شیطانی نظام معیشت پر چل رہا ہو بلکہ دنیا کے اکثر ممالک کا یہی حال ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیوالیہ پن سے

بچانے کے لیے یا بالفاظ دیگر اپنے دیوالیہ پن کو کسی اور ملک پر ڈال دینے کے لیے مجبور ہوگئے ہیں، اس طرح بین الاقوامی مسابقت شروع ہوجاتی ہے اور وہ چند صورتیں اختیار کرتی ہے۔

اوّلاً ہر ملک بین الاقوامی بازار میں اپنا مال بیچنے کی کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ مال تیار کرے۔ اس غرض سے کارکنوں کے معاوضے بہت کم رکھے جاتے ہیں اور معاشی کاروبار میں ملک کی عام آبادی اتنا کم حصہ پاتی ہے کہ اصلی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔

ثانیاً ہر ملک اپنے حدود میں اور اپنے حلقۂ اثر میں دوسرے ملک کا مال آنے پر بندشیں عائد کرتا ہے اور خام پیداوار کے جتنے وسائل اس کے زیر اختیار رہیں، ان پر بھی پہرے بٹھاتا ہے تاکہ دوسرا ملک ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس سے بین الاقوامی کشمکش پیدا ہوتی ہے جس کا انجام جنگ ہوتا ہے۔

ثالثاً ایسے ملک جو اس دیوالیہ پن کی مصیبت کو اپنے سر چپکے جانے سے روک نہیں سکتے، ان پر لٹیرے ٹوٹ پڑتے ہیں اور صرف اپنے ملک کے بچے کھچے مال ہی کو ان میں فروخت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جس دولت کو خود اپنے ہاں نفع آور کام پر لگانے کی گنجائش نہیں ہوتی، اسے بھی ان ممالک میں لے جاکر لگاتے ہیں۔ اس طرح آخر کار ان ممالک میں بھی وہی مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے جو ابتداءً خود روپیہ لگانیوالے ملکوں میں پیدا ہوا تھا، یعنی جس قدر روپیہ وہاں لگایا جاتا ہے، وہ سارا کا سارا وصول نہیں ہوسکتا اور اس روپے سے جتنی بھی آمدنی ہوتی، اس کا ایک بڑا حصہ پھر مزید نفع آور کاموں میں لگا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ ان ملکوں پر قرض کا بار اتنا بڑھتا چلا جاتا ہے کہ اگر خود ان ملکوں کو بیچ ڈالا جائے تب بھی کل لگائی ہوئی رقم بازیافت نہیں ہوسکتی۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ چکر یونہی چلتا رہے تو بالآخر تمام دنیا دیوالیہ ہوجائے گی اور روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہے گا جس کی طرف اس دیوالیہ پن کی مصیبت

کو منتقل کیا جا سکے حتّٰی کہ پھر ضرورت پیش آئے گی کہ مشتری اور مریخ اور عطارد میں روپیہ لگانے اور زائد مال کو کھپانے کے لیے مارکیٹ تلاش کیے جائیں۔

اس عالمگیر محاربے میں بینکروں، آڑھتیوں اور صنعت و تجارت کے رئیسوں کی مٹھی بھر جماعت تمام دنیا کے معاشی اسباب و وسائل پر اس طرح حاوی ہو گئی ہے کہ ساری نوعِ انسانی ان کے مقابلے میں بالکل بے بس ہے۔ اب کسی شخص کے لیے قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے اور اپنے دماغ کی قابلیت سے کوئی آزادانہ کام کر سکے اور خدا کی زمین پر جو اسبابِ زندگی موجود ہیں ان میں سے خود کوئی حصہ حاصل کر سکے۔ چھوٹے تاجر، چھوٹے صناع، چھوٹے زراعت پیشہ کے لیے آج دنیا کے عرصۂ حیات میں ہاتھ پاؤں مارنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ سب کے سب مجبور ہیں کہ معاشی کاروبار کے ان بادشاہوں کے غلام اور نوکر اور مزدور بن کر رہیں اور یہ لوگ کم سے کم سامانِ زیست کے معاوضے میں ان کے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اور ان کا سارا وقت لے لیتے ہیں جس کی وجہ سے پوری نوعِ انسانی بس ایک معاشی حیوان بن کر رہ گئی ہے۔ بہت کم خوش قسمت انسانوں کو اس معاشی کشمکش میں اتنی فرصت نصیب ہوتی ہے کہ اپنے اخلاقی اور روحانی ارتقاء کے لیے بھی کچھ کر سکیں اور پیٹ بھرنے سے بالاتر بھی کسی مقصد کی طرف توجہ کر سکیں اور اپنی شخصیت کے ان عناصر کو بھی نشوونما دے سکیں جو تلاشِ معاش کے سوا دوسری پاکیزہ تر اغراض کے لیے خدا نے ان کے اندر ودیعت کیے تھے۔ درحقیقت اس شیطانی نظام کی بدولت معاشی کشمکش اس قدر سخت ہو جاتی ہے کہ زندگی کے تمام دوسرے شعبے اس سے ماؤف و معطل ہو جاتے ہیں۔

انسان کی مزید بدنصیبی یہ ہے کہ دنیا کے اخلاقی فلسفے، سیاسی نظامات اور قانونی اصول بھی اس شیطانی نظامِ معیشت سے متاثر ہو گئے۔ مشرق سے مغرب تک ہر طرف اخلاقی معلمین کفایت شعاری پر زور دے رہے ہیں۔ "جتنا کمانا اتنا ہی خرچ کرنا"، "

حماقت اور ایک اخلاقی عیب سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص کو تعلیم دی جاتی ہے کہ اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرکے بنیک میں ڈپازٹ رکھے، یا انشورنس پالیسی خریدے یا کمپنیوں کے شیرز حاصل کرے۔ گویا جو چیز انسانیت کو تباہ کرنے والی ہے وہی اخلاقی کی نظر میں معیارِ خوبی بن گیا ہے۔ رہی سیاسی طاقت تو وہ عملاً بالکل ہی ایک شیطانی نظام کے قبضے میں آ چکی ہے، وہ بجائے اس کے کہ اس ظلم سے انسان کو بچائے، ظلم کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے اور ہر طرف حکومت کی گدّیوں پر شیطان کے ایجنٹ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے قوانین بھی اس نظام کے زیر اثر مرتب ہو رہے ہیں۔

ان قوانین نے عملاً افراد کو پوری آزادی دے رکھی ہے کہ جس طرح چاہیں جماعت کے مفاد کے خلاف اپنی معاشی اغراض کے لیے جدوجہد کریں، روپیہ کمانے کے طریقوں میں جائز اور ناجائز کا امتیاز قریب قریب مفقود ہے۔ ہر وہ طریقہ جس سے کوئی شخص دوسروں کو لوٹ کر یا تباہ کرکے مالدار بن سکتا ہو، قانون کی نظر میں جائز ہے۔ شراب بنائیے اور بیچیے، بداخلاقی کے اڈے قائم کیجیے، شہوانی فلم بنائیے، فحش مضامین لکھیے، جذبات کو بھڑکانے والی تصویریں شائع کیجیے، سٹے کا کاروبار پھیلائیے، سود خواری کے ادارے قائم کیجیے، قماربازی کی نئی نئی صورتیں نکالیے، غرض جو چاہے کیجیے، قانون نہ صرف آپ کو اس کی اجازت دے گا بلکہ الٹی آپ کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ پھر جو دولت اس طریقے سے سمٹ کر ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی ہو قانون یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی ایک ہی جگہ سمٹی رہے، چنانچہ اولادِ اکبر کے وارث ہونے کا طریقہ (RULE OF PRIMOGENITURE) اور بعض قوانین بنانے کا طریقہ اور مشترک خاندان کا طریقہ (JOINT FAMILY SYSTEM) ان سب کی غرض یہی ہے کہ خزانے کا ایک سانپ جو مرے تو اس پر دوسرا سانپ بٹھا دیا جائے اور اگر بدقسمتی سے اس سانپ نے کوئی سپولیا نہ چھوڑا ہو تو کہیں اور سے ایک سپولیا حاصل کیا جائے تاکہ

دولت کے اس سمٹاؤ میں فرق نہ آنے پائے۔

یہ اسباب ہیں، جن سے نوعِ انسانی کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ خدا کی اس زمین پر ہر شخص کو سامانِ زیست بہم پہنچنے کا انتظام کس طرح کیا جائے اور ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشو و نما دینے کے مواقع کیسے ملیں؟

اشتراکیت کا تجویز کردہ حل

اس مسئلے کے حل کی ایک صورت اشتراکیت نے تجویز کی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیدائشِ دولت کے وسائل افراد کی ملکیت سے نکال کر جماعتی ملکیت بنا دیے جائیں اور ضروریاتِ زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت ہی کے سپرد ہو۔ بظاہر یہ حل نہایت معقول نظر آتا ہے لیکن اس کے عملی پہلوؤں پر آپ جس قدر غور کریں گے اسی قدر آپ پر اس کے نقائص کھلتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخرکار اس کے نتائج بھی اتنے ہی خراب ہیں جتنے اس بیماری کے نتائج ہیں جس کا علاج کرنے کے لیے اسے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بالکل ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ وسائل پیدائش سے کام لینے اور پیداوار کو تقسیم کرنے کا انتظام خواہ نظری طور پر پوری جماعت کے حوالے کر دیا جائے مگر عملاً یہ کام ایک مختصر سی ہیئتِ انتظامیہ (EXECUTIVE) ہی کے سپرد کرنا ہوگا۔ یہ مختصر گروہ ابتداءً جماعت (COMMUNITY) ہی کا منتخب کردہ سہی لیکن جب تمام ذرائع معاش اس کے قبضے میں ہوں گے اور اسی کے ہاتھوں سے لوگوں تک پہونچ سکیں گے تو تمام آبادی اس کی مٹھی میں بے بس ہو جائے گی، اس کی رضا کے خلاف ملک میں کوئی دم تک نہ مار سکے گا اور اس کے مقابلے میں کوئی ایسی منظم جماعت ابھر نہ سکے گی جو اس کو منصب و اقتدار سے ہٹا سکے۔ اس کی نظر کسی سے پھر جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ تصور وار بندہ اس سرزمین میں زندگی بسر کرنے کے تمام وسائل سے محروم ہو جائے، کیونکہ سارے وسائل پر اس مختصر گروہ کا تسلط ہوگا مزدوروں میں اتنا

یارانہ ہوگا کہ اس کے انتظام سے ناراض ہو، تو اسٹرائک کر دے کیونکہ وہاں بہت سے کارخانے دار نہ ہوں گے کہ ایک در سے اٹھے تو دوسرے کے دروازے پر چلے گئے بلکہ سارے ملک میں ایک ہی کارخانے دار ہوگا، اور وہی حکمران بھی ہوگا اور اس کے خلاف کسی رائے عام کی ہمدردی بھی حاصل نہ کی جا سکے گی۔ اس طرح یہ صورت جس نتیجے پر جا کر ختم ہوگی وہ یہ ہے کہ تمام سرمایہ داروں کو کھا کر ایک بڑا سرمایہ دار تمام کارخانے داروں اور زمینداروں کو کھا کر ایک بڑا کارخانہ دار و زمیندار لوگوں پر مسلط ہو جائے اور وہی بیک وقت زار اور قیصر بھی ہو۔

اوّل تو یہ اقتدار اور ایسا مطلق اقتدار وہ چیز ہے جس کے نشے میں بہک کر ظالم و جابر بننے سے رک جانا انسان کے لیے بہت مشکل ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ اپنے اوپر کسی خدا کا اور اس کے سامنے جوابدہی کا اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ ایسے اقتدار مطلق پر قابض ہونے کے بعد بھی یہ مختصر گروہ آپے سے باہر نہ ہوگا۔ اور عدل و انصاف ہی کے ساتھ کام کرے گا، تب بھی ایسے ایک نظام میں افراد کے لیے اپنی شخصیت کے ارتقاء کے لیے سب سے بڑھ کر جس چیز کی احتیاج ہے وہ یہ ہے کہ اسے آزادی حاصل ہو، کچھ وسائل کار اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں جنہیں وہ اپنے اختیار سے استعمال کر سکے اور ان وسائل پر اپنے رجحان کے مطابق کام کر کے اپنی مخفی قوتوں کو ابھارے اور چمکائے مگر اشتراکی نظام میں اس کا کوئی امکان نہیں۔ اس میں وسائل افراد کے اختیار میں نہیں رہتے بلکہ جماعت کی ہیئت انتظامیہ کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں اور وہ ہیئت انتظامیہ جماعتی مفاد کا جو تصوّر رکھتی ہے اس کے مطابق ان وسائل کو استعمال کرتی ہے۔ افراد کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ ان وسائل سے استفادہ کرنا چاہیں تو اس نقشے کے مطابق کام کریں، بلکہ اسی نقشے کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالے جانے کے لیے ان منتظمین کے سپرد کر دیں۔ جو انہوں نے جماعتی مفاد کے لیے تجویز کیا ہے۔ جو چیز عملاً سوسائٹی کے

تمام افراد کو چند انسانوں کے قبضے میں اس طرح دے دیتی ہے کہ گویا وہ سب بے روح مواد خام ہیں اور جیسے چمڑے کے جوتے اور لوہے کے پرزے بنائے جاتے ہیں اس طرح وہ چند انسان مختار ہیں کہ وہ بہت سے انسانوں کو اپنے نقشے کے مطابق ڈھالیں اور بنائیں۔

انسانی تمدن و تہذیب کے لیے اس کا نقصان اس قدر زیادہ ہے کہ اگر بالفرض اس نظام کے تحت ضروریاتِ زندگی انصاف کے ساتھ تقسیم بھی ہوں تو اس کا فائدہ اس نقصان کے مقابلے میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ تمدن و تہذیب کی ساری ترقی منحصر ہے اس پر کہ مختلف انسان جو مختلف قسم کی قوتیں اور قابلیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں، ان کو پوری طرح نشو و نما پانے اور پھر اپنا اپنا حصہ اس مشترک زندگی میں ادا کرنے کا موقع ملے۔ یہ بات ایسے نظام میں حاصل نہیں ہو سکتی جس کے اندر انسانوں کا پلاننگ (PLANNING) کیا جاتا ہو۔ چند انسان خواہ وہ کتنے ہی لائق اور کتنے ہی نیک اندیش ہوں، بہر حال اتنے علیم و خبیر نہیں ہو سکتے کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کی خلقی قابلیتوں اور ان کے فطری رجحانات کا صحیح اندازہ کر سکیں اور پھر ان کے نشوونما کا ٹھیک ٹھیک راستہ متعین کر سکیں۔ وہ اس میں علم کے اعتبار سے بھی غلطی کریں گے اور جماعتی مفاد یا جماعتی ضروریات کے متعلق جو تخمینہ ان کے ذہن میں ہوگا اس کے لحاظ سے بھی یہ چاہیں گے کہ ان کے زیرِ اثر جتنے انسانوں کی آبادی ہو وہ ان کے نقشے پر ڈھال دی جائے۔ اس کے تمدن کی گونا گونی ختم ہو کر ایک بے روح یکسانی میں تبدیل ہو جائے گی، اس سے تمدن کا فطری ارتقاء بند اور ایک طرح کا مصنوعی و جعلی ارتقاء شروع ہو جائے گا، اس سے انسانی قوتیں ٹھٹھرتی چلی جائیں گی اور بالآخر ایک شدید ذہنی و اخلاقی انحطاط رونما ہوگا۔ انسان بہر حال چمن کی گھاس اور بیل بوٹے نہیں ہیں کہ ایک مالی انہیں کاٹ چھانٹ کر مرتب کر لے اور وہ اسی کے نقشے پر گھٹتے اور بڑھتے رہیں۔ ہر آدمی اپنا ایک تشخص رکھتا ہے جو اپنی فطری رفتار پر بڑھنا چاہتا ہے۔ تم اس کی یہ آزادی سلب کرو گے تو وہ تمہارے نقشے پر نہیں بڑھے گا، بلکہ

بغاوت کرے گا، یا مرجھا کر رہ جائے گا۔

اشتراکیت کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ معاش کے مسئلے کو مرکزی مسئلہ قرار دے کر پوری انسانی زندگی کو اس کے گرد گھما دیتی ہے۔ زندگی کے کسی مسئلے پر بھی اس کی نظر مجرد تحقیقی نظر نہیں ہے بلکہ سارے مسائل کو وہ ایک گہرے معاشی تعصب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مابعد الطبیعیات، اخلاق، تاریخ، سائنس، علوم عمران، غرض ہر چیز اس کے معاشی نقطۂ نظر سے مغلوب و متاثر ہے اور اس یک رخے پن کی وجہ سے زندگی کا پورا توازن بگڑ جاتا ہے۔

فاشزم کا حل

پس درحقیقت اشتراکی نظریہ انسان کے معاشی مسئلہ کا کوئی صحیح فطری حل نہیں ہے بلکہ ایک غیر فطری مصنوعی حل ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا حل فاشزم اور نیشنل سوشلزم نے پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وسائل معیشت پر شخصی تصرف تو باقی رہے مگر جماعتی مفاد کی خاطر اس تصرف کو ریاست کے مضبوط کنٹرول میں رکھا جائے، لیکن عملاً اس کے نتائج بھی اشتراکی نظریے کے نتائج سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتے۔ اشتراکیت کی طرح یہ نظریہ بھی فرد کو جماعت میں گم کر دیتا ہے اور اس کی شخصیت کے آزادانہ نشوونما کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑتا۔ مزید برآں جو ریاست اس شخصی تصرف کو قابو میں رکھنی ہے وہ اتنی ہی مستبد اور جابر و قاہر ہوتی ہے جتنی اشتراکی ریاست۔ ایک بڑے ملک کی تمام حرفت کو اپنے پنجۂ اقتدار میں رکھنے اور اپنے دیے ہوئے نقشے پر کام کرنے کے لیے مجبور کرنا بڑی زبردست قوتِ قاہرہ چاہتی ہے اور جس ریاست کے ہاتھ میں ایسی قاہرانہ طاقت ہو اس کے ہاتھ میں ملک کی آبادی کا بے بس ہو جانا اور حکمرانوں کا غلام بن کر رہ جانا بالکل یقینی ہے۔

اسلام کا حل

اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلام کس طرح اس مسئلے کو حل کرتا ہے۔ اسلام نے تمام مسائلِ حیات میں اس قاعدے کو ملحوظ رکھا ہے کہ زندگی کے جو اصول فطری ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور فطرت کے راستے سے جہاں

انحراف ہوا ہے وہیں سے اس کو موڑ کر فطرت کے راستے پر ڈال دیا جائے۔ دوسرا اہم قاعدہ جس پر اسلام کی تمام اصلاحات مبنی ہیں وہ یہ ہے کہ صرف خارجی طور پر تمام تمدن میں چند ضابطے جاری کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ سب سے زیادہ زور اخلاق اور ذہنیت کی اصلاح پر صرف کیا جائے تاکہ نفس انسانی میں خرابی کی جڑ کٹ جائے۔ تیسرا اساسی قاعدہ جس کا نشان آپ کو تمام اسلامی نظام شریعت میں ملے گا، یہ ہے کہ حکومت کے جبر اور قانون کے زور سے صرف وہیں کام لیا جائے جہاں ایسا کرنا گزیر ہو۔ ان تین قاعدوں کو ملحوظ رکھ کر اسلام زندگی کے معاشی شعبے میں ان تمام غیر فطری اصولوں کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی اصلاح اور کم سے کم حکومتی مداخلت کے ذریعہ مٹاتا ہے جو شیطانی اثر سے انسان نے اختیار کیے ہیں۔ یہ امر کہ انسان اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرنے میں آزاد ہو، یہ بات کہ انسان اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرے اس پر اسے حقوق مالکانہ حاصل ہوں اور یہ کہ انسانوں کے درمیان ان کی قابلیتوں اور ان کے حالات کے لحاظ سے فرق و تفاوت ہو، ان سب چیزوں کو اسلام اس حد تک تسلیم کرتا ہے جس حد تک یہ منشائے فطرت کے مطابق ہیں، پھر وہ ان پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جو انہیں حد فطرت سے متجاوز اور ظلم و بے انصافی کا موجب نہ بننے دیں۔

سب سے پہلے دولت کمانے کے سوال کو لیجیے۔ اسلام نے انسان کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ خدا کی زمین میں وہ اپنی طبیعت کے رجحان اور اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق خود اپنی زندگی کا سامان تلاش کرے لیکن وہ اس کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی معاش حاصل کرنے کے لیے اخلاق کو خراب کرنے والے یا تمدن کے نظام کو بگاڑنے والے ذرائع اختیار کرے۔ وہ کسب معاش کے ذرائع میں حرام اور حلال کی تمیز قائم کرتا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ چن چن کر ایک ایک نقصان رساں طریقے کو حرام کر دیتا ہے۔ اس کے قانون میں شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں نہ صرف بجائے خود حرام ہیں بلکہ ان کا بنانا، بیچنا، خریدنا،

رکھنا سب حرام ہے۔ وہ زنا اور رقص و سرود اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع کو بھی جائز ذرائع کسبِ معاش تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ایسے تمام وسائلِ معیشت کو بھی ناجائز ٹھہراتا ہے جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے لوگوں کے یا سوسائٹی کے نقصان پر مبنی ہو، رشوت، چوری، جوا اور سٹہ، دھوکے اور فریب کے کاروبار، اشیائے ضرورت کو اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں گراں ہوں، معاشی وسائل کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا اجارہ قرار دینا کہ دوسروں کے لیے جدوجہد کا دائرہ تنگ ہو، ان سب طریقوں کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے، نیز کاروبار کی ایسی تمام شکلوں کو اس نے چھانٹ چھانٹ کر ناجائز قرار دیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نزاع (LITIGATION) پیدا کرنے والی ہوں یا جن میں فریقین کے درمیان حقوق کا تعین نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے اس تجارتی قانون کا تفصیلی مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جن طریقوں سے لوگ کروڑپتی بنتے ہیں، ان میں سے بیشتر طریقے وہ ہیں جن پر اسلام نے سخت قانونی بندشیں عائد کردی ہیں۔ وہ جن وسائل کسب معاش کو جائز ٹھہراتا ہے ان کے دائرے میں محدود رہ کر کام کیا جائے تو اشخاص کے لیے بے اندازہ دولت سمیٹتے چلے جانے کا بہت کم امکان ہے۔

اب دیکھیے جائز ذرائع سے جو کچھ انسان حاصل کرے اس پر اسلام اس شخص کے حقوقِ ملکیت کو تو تسلیم کرتا ہے مگر اس کے استعمال میں اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ اس پر بھی متعدد طریقوں سے پابندیاں عائد کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس کمائی ہوئی دولت کے استعمال کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں، یا اس کو خرچ کیا جائے، یا اسے نفع آور کاموں پر لگایا جائے، یا اُسے جمع کیا جائے۔ ان میں سے ایک ایک پر اسلام نے جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کی مختصر کیفیت میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

خرچ کرنے کے جتنے طریقے اخلاق کو نقصان پہنچانے والے ہیں یا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے وہ سب ممنوع ہیں۔ آپ جوئے میں اپنی دولت نہیں اڑا سکتے، آپ

شراب نہیں پی سکتے، آپ زنا نہیں کر سکتے، آپ گانے بجانے اور ناچ رنگ اور عیاشی کی دوسری صورتوں میں اپنا روپیہ نہیں بہا سکتے، آپ ریشمی لباس نہیں پہن سکتے، آپ سونے اور جواہرات کے زیور استعمال نہیں کر سکتے، آپ تصویروں سے اپنی دیواروں کو مزین نہیں کر سکتے۔

غرض یہ کہ اسلام نے ان تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے جن سے انسان کی دولت کا بیشتر حصہ اس کی اپنی نفس پرستی پر صرف ہو جاتا ہے۔ وہ خرچ کی جن جن صورتوں کو جائز رکھتا ہے وہ اس قسم کی ہیں کہ آدمی بس ایک اوسط درجے کی شستہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرے اور اس سے زائد اگر کچھ بچتا ہو تو اسے خرچ کرنے کا راستہ اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، رفاہِ عام میں اور ان لوگوں کی امداد میں صرف کیا جائے جو معاشی دولت میں سے اپنی ضروریات کے مطابق حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔ اسلام کے نزدیک بہترین طرزِ عمل یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اسے اپنی جائز اور معقول ضرورتوں پر خرچ کرے اور پھر جو بچ رہے اسے دوسروں کو دیدے تاکہ وہ اپنی ضرورتوں پر صرف کرے۔ اس صفت کو اسلام نے بلند ترین اخلاق کے معیاروں میں داخل کیا ہے اور ایک آئیڈیل کی حیثیت سے اس کو اتنے زور کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جب کبھی سوسائٹی پر اسلامی اخلاقیات کا اثر غالب ہوگا، اجتماعی زندگی میں وہ لوگ زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے جو کمائیں اور خرچ کر دیں اور ان لوگوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا جائے گا جو دولت کو سمیٹ سمیٹ کر رکھنے کی کوشش کریں یا کمائی ہوئی دولت کے بچے ہوئے حصے کو پھر کمانے کے کام میں لگانا شروع کر دیں۔

تاہم مجرد اخلاقی تعلیم کے ذریعہ اور سوسائٹی کے اخلاقی اثر اور دباؤ سے غیر معمولی حرص و طمع رکھنے والے لوگوں کی کمزوریوں کا بالکل استیصال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود پھر بھی بہت سے ایسے لوگ باقی رہیں گے جو اپنی ضروریات سے زیادہ کمائی ہوئی دولت کو پھر مزید زائد از ضرورت دولت کمانے میں لگانا چاہیں گے، اس لیے اسلام نے

اس کے استعمال کے طریقوں پر چند قانونی پابندیاں عائد کردی ہیں۔ اس بچی ہوئی دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے سود پر چلایا جائے، اسلامی قانون میں قطعی حرام ہے اگر آپ کسی کو اپنا مال قرض دیتے ہیں تو خواہ اس نے وہ قرض اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہو یا وسیلۂ معاش پیدا کرنے کے لیے بہرحال آپ اس سے صرف اپنا اصل ہی واپس لینے کے حقدار ہیں۔ اس طرح اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کی کمر توڑ دیتا ہے اور اس سب سے بڑے ہتھیار کو کند کر دیتا ہے جس کے ذریعے سے سرمایہ دار محض اپنے سرمائے کے بل پر آس پاس کی معاشی دولت کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ رہا فاضل دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے انسان خود اپنی تجارت یا صنعت و حرفت یا دوسرے کاروبار میں لگائے یا دوسروں کے ساتھ نفع و نقصان کا شریک ہو کر سرمایہ فراہم کرے تو اسلام اسے جائز رکھتا ہے اور اس سے جو زائد از ضرورت دولت اشخاص کے پاس سمٹ جاتی ہے اور اس سے جو زائد از ضرورت دولت اشخاص کے پاس سمٹ جاتی ہے اس کا علاج دوسرے طریقوں سے کرتا ہے۔

اسلام نے زائد از ضرورت دولت جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ ابھی میں کہہ چکا ہوں اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے، یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرد یا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی ضروریات خریدیں۔ اور اس طرح پوری دولت گردش میں برابر آتی رہے لیکن تم اگر ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے ہی پر اصرار کرتے ہو، تو تمہاری اس جمع کردہ دولت میں سے از روئے قانون ۲½ فیصد سالانہ رقم نکلوالی جائے گی اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائے گا جو معاشی جد وجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں یا سعی و جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اس کے انتظام کی صورت جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے مشترکہ خزانے میں جمع کیا جائے اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات کا کفیل بن جائے جو مدد کے حاجتمند ہیں۔ یہ دراصل سوسائٹی کے لیے انشورنس کی بہترین

صورت ہے اور ان تمام خرابیوں کا استیصال کرتی ہے جو اجتماعی امداد و معاونت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ سرمایہ داری نظام میں جو چیز انسان کو دولت جمع کرنے اور اسے نفع آور کاموں میں لگانے پر مجبور کرتی ہے اور جس کی وجہ سے لائف انشورنس وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی اس نظام میں اپنے ہی ذرائع پر منحصر ہے۔ بوڑھا ہوجائے اور کچھ بچا کر نہ رکھا ہو تو بھوکا مرجائے، بال بچوں کے لیے کچھ چھوڑے بغیر مرجائے تو وہ در بدر مارے پھریں اور بھیک کا ٹکڑا تک نہ پاسکیں، بیمار ہوجائے اور کچھ بچا بچایا نہ رکھا ہو تو علاج تک نہ کرا سکے، گھر جل جائے۔ یا کاروبار میں نقصان ہو یا کوئی اور آفت ناگہانی آجائے تو کسی طرف سے اس کو سہارا ملنے کی امید نہیں۔ اسی طرح سرمایہ داری نظام میں جو چیز محنت پیشہ لوگوں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بن جانے اور ان کی شرائط پر کام کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے وہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ اس کی محنت کا معاوضہ سرمایہ دار دیتا ہے، اسے لینا اگر غریب آدمی قبول نہ کرے تو فاقہ کرے اور ننگا پھرے۔ سرمایہ دار کی بخشش سے منہ موڑ کر اسے دو وقت کی روٹی میسر آنی مشکل ہے۔ پھر یہ لعنت کبریٰ جو آج سرمایہ داری نظام کی بدولت دنیا پر مسلط ہے کہ ایک طرف لاکھوں کروڑوں انسان حاجتمند موجود ہیں اور دوسری طرف زمین کی پیداوار اور کارخانوں کی مصنوعات کے انبار لگے ہوتے ہیں مگر خریدے نہیں جاسکتے، حتیٰ کہ لاکھوں من گیہوں سمندر میں پھینکا جاتا ہے اور بھوکے انسانوں کے پیٹ تک نہیں پہنچتا۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ حاجتمند انسانوں تک وسائل معیشت پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ان سب کے اندر قوت خریداری پیدا کردی جائے اور وہ اپنے حسب حاجت اشیاء خریدنے کے قابل ہوجائیں تو صنعت، تجارت، زراعت غرض ہر انسانی حرفت پھلتی پھولتی جائے۔ اسلام زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعے سے ان ساری خرابیوں کا استیصال کرتا ہے۔ بیت المال ہر وقت آپ کی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود ہے۔ آپ کو فکر فردا کی ضرورت نہیں، جب آپ حاجتمند

ہوں، بیت المال میں جائیے اور اپنا حق لے آئیے، پھر بینک ڈیپازٹ اور انشورنس پالیسی کی کیا ضرورت؟ آپ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر باطمینان دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ آپ کے پیچھے جماعت کا خزانہ ان کا کفیل ہے۔ بیماری، بڑھاپے، آفاتِ ارضی و سماوی ہر صورتحال میں بیت المال وہ دائمی مددگار ہے جس کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ اسی کی شرائط پر کام کرنا قبول کریں۔ بیت المال کی موجودگی میں آپ کے لیے فاقے اور برہنگی اور بے جائیگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ پھر یہ بیت المال سوسائٹی کے تمام ان لوگوں کو اشیائے ضرورت خریدنے کے قابل بنا دیتا ہے جو دولت پیدا کرنے کے بالکل ناقابل ہوں یا کم پیدا کر رہے ہوں۔ اس طرح مال کی نیاری اور اس کی کھپت کا توازن باہم قائم رہتا ہے اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ آپ اپنے دیوالیہ پن کو دنیا بھر کے سر چپکنے کے لیے دوڑتے پھریں اور آخر کار دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی ضرورت پیش آئے

زکوٰۃ کے علاوہ دوسری تدبیر جو ایک جگہ سمٹی ہوئی دولت کو پھیلانے کے لیے اسلام نے اختیار کی ہے وہ قانونِ وراثت ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے قوانین کا رجحان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے سمیٹی ہے وہ اس کے مرنے کے بعد بھی سمٹی رہے، مگر اسلام اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ جس دولت کو ایک شخص سمیٹ سمیٹ کر قید کرتا رہا ہے اس کے مرتے ہی وہ پھیلا دی جائے۔ اسلامی قانون میں بیٹے، بیٹیاں، باپ، ماں، بیوی، بھائی، بہن سب ایک شخص کے وارث ہیں۔ اور ایک ضابطے کے مطابق سب پر میراث تقسیم ہونی ضروری ہے۔ قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور پرے کے رشتہ دار تلاش کیے جائیں گے اور ان میں یہ دولت پھیلائی جائے گی۔ کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو، تب بھی آدمی کو متبنّیٰ بنانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کی وارث پوری جماعت ہے، اس کی سمیٹی ہوئی تمام دولت بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ اس طرح خواہ کوئی شخص کروڑوں اعراریوں کی دولت جمع کر لے، اس کے مرنے کے

بعد دو تین پشتوں کے اندر وہ سب کی سب چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر پھیل جائے گی اور دولت کا ہر سمٹاؤ بتدریج پھیلاؤ میں تبدیل ہو کر رہے گا۔

یہ نظام معیشت جس کا نہایت مختصر سا نقشہ میں نے پیش کیا ہے اس پر غور کیجیے، کیا یہ شخصی ملکیت کے ان تمام نقصانات کو دور نہیں کر دیتا جو شیطان کی غلط تعلیم کے سبب رونما ہوتے ہیں۔ پھر آخر اس کی کیا حاجت ہے کہ ہم اشتراکی نظریہ یا فاشزم اور نیشنل سوشلزم کے نظریات کو اختیار کر کے معاشی انتظام کے وہ مصنوعی طریقے استعمال کریں جو ایک خرابی کو دور نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ دوسری خرابی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہاں میں نے اسلام کے پورے نظامِ معاشی کو بیان نہیں کیا ہے۔ زمین کے انتظام اور کاروباری نزاعات (TRADE DISPUTES) کے تصفیے اور صنعت و حرفت کے لیے سرمائے کی فراہمی کی جو صورتیں اسلام کے اصول پر اختیار کی جا سکتی ہیں اور جن کے لیے قانونِ اسلام میں پوری گنجائش بھی رکھی گئی ہے انہیں اس مختصر مقالے میں پیش کرنا مشکل ہے نیز اسلام نے جس طرح درآمد و برآمد کے محصولات اور اندرونِ ملک میں اموالِ تجارت کی نقل و حرکت پر چنگی کی پابندیوں کو اڑا کر اشیائے ضرورت کے آزاد مبادلے کا راستہ کھولا ہے، اس کا ذکر بھی میں نہیں کر سکا ہوں۔ ان سب سے بڑھ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے کہ ملکی انتظام اور سول سروس اور فوج کے مصارف کو انتہائی ممکن حد تک گھٹا کر اور عدالت سے اسٹامپ ڈیوٹی کو قطعی طور پر ہٹا کر اسلام نے سوسائٹی پر سے جس عظیم الشان معاشی بوجھ کو ہلکا کیا ہے اور ٹیکسوں کو انتظام کی حد سے بڑھے ہوئے مصارف میں کھپا دینے کے بجائے سوسائٹی کی آسائش اور بہتری پر صرف ہونے کے جو مواقع پیدا کیے ہیں، ان کی بدولت اسلام کا معاشی نظام انسان کے لیے کتنی بڑی رحمت بن جاتا ہے۔ اگر تعصب کو چھوڑ دیا جائے اور آبا و اجداد سے جو جاہلانہ تنگ نظری وراثت میں ملی ہے یا غیر اسلامی نظامات کے دنیا پر غالب آجانے سے جو مرعوبیت دماغوں پر

چھا گئی ہے، اسے دور کر کے آزاد تحقیق کی نگاہ سے اس نظام کا مطالعہ کیا جائے تو میں توقع
کرتا ہوں کہ ایک بھی معقول و منصف مزاج آدمی ایسا نہ ملے گا جو انسان کی معاشی فلاح
کے لیے اس نظام کو سب سے زیادہ مفید، صحیح اور معقول تسلیم نہ کرے لیکن اگر کسی شخص
کے ذہن میں یہ غلط فہمی ہو کہ اسلام کے پورے اعتقادی، اخلاقی، تمدنی مجموعے میں سے
صرف اس کے معاشی نظام کو لے کر کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے تو میں عرض کرونگا
کہ براہ کرم وہ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دے۔ اس معاشی نظام کا گہرا ربط اسلام
کے سیاسی، عدالتی، قانونی اور تمدنی و معاشرتی نظام کے ساتھ ہے۔ پھر ان سب چیزوں
کی بنیاد اسلام کے نظامِ اخلاق پر قائم ہے اور وہ نظامِ اخلاق بھی اپنے آپ پر قائم نہیں
ہے، بلکہ اس کے قیام کا پورا انحصار اس پر ہے کہ آپ ایک عالم الغیب، قادرِ مطلق خدا پر
ایمان لائیں اور اپنے آپ کو اس کے سامنے جوابدہ سمجھیں، موت کے بعد آخرت کی
زندگی کو مانیں۔ اور آخرت میں عدالتِ الٰہی کے سامنے اپنے پورے کارنامۂ حیات
کے جانچے جانے اور اس جانچ کے مطابق جزا و سزا پانے کا یقین رکھیں اور خدا کی طرف
سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جو ضابطۂ اخلاق و قانون آپ تک پہنچایا ہے،
جس کا جزو یہ معاشی نظام بھی ہے وہ بے کم و کاست خدا ہی کی ہدایت پر مبنی ہے۔ اگر اس
عقیدے اور اس نظامِ اخلاق اور اس پورے ضابطۂ حیات کو آپ جوں کا توں نہ
لیں گے تو نرا اسلامی نظامِ معاشی ایک دن بھی اپنی صحیح اسپرٹ کے ساتھ نہ چل سکے گا
اور نہ اس سے آپ کوئی معتد بہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔